© rasailojaraid.com

حضرت خواجہ غلام فریدؒ کا چولستان

مسرت کلانچوی*

دنیا کا تیسرا بڑا صحرا، صحرائے چولستان جو دس ہزار تین سو ستانوے مربع میل پر محیط ہے، اِس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ افراد سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ بہاول نگر، رحیم یار خان اور بہاولپور اضلاع کے تقریباً دو تہائی حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں دریائے ستلج اور جنوب میں دریائے سندھ کا زرعی علاقہ ہے۔ مشرق اور جنوب میں اس صحرا کے آخری کنارے بھارت کی سرحدوں سے جا ملتے ہیں۔ سرحد سے پرے راجستھان کے صحرائی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق چولستان کا عہد آبادکاری ہڑپائی عہد سے بھی قدیم ہے۔ اسے علمی اصطلاح میں ہاکڑہ دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے آثار زیادہ تر دریائے ہاکڑہ کے سیلابی میدانوں کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ یہ آثار پانچ سے چھ ہزار قبل کے درمیانی عرصہ سے متعلق ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب پتھر کی صنعت فروغ پا رہی تھی۔ ہاکڑہ دور کے بعد چولستان میں جو تمدنی دور آیا۔ یہ اکتیس سو قبل مسیح سے ڈھائی ہزار قبل مسیح کے برتنوں سے متعلق اشیاء کا دور تھا۔ جسے کوٹ دیجی دور کہتے ہیں۔ چولستان کے ان آثار سے وادی سندھ کی تہذیب کے چار ہزار سال قدیم ارتقائی تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساڑھے چار ہزار سال قبل چولستان میں سماجی طبقات ابھر چکے تھے۔

چولستان میں سب سے قدیم تمدن کے آثار ۳۳ مقامات پر ملتے ہیں۔ یہ آثار بلاشبہ پانچ اور چھ ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیادہ تر بستیوں کے آثار قلعہ دراوڑ کے اطراف اور دریائے ہاکڑہ کی گزرگاہ کے وسط میں پائے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ دریائے ہاکڑہ پہلی ہزارویں قبل مسیح کے لگ بھگ خشک ہونے لگا۔[1]

محققین کی تحقیق کے مطابق میلوں دور تک پھیلا ہوا چولستان جو آج بنجر اور غیر آباد نظر آتا ہے کبھی یہاں سے دریائے ہاکڑہ بہتا تھا اور یہ علاقہ نہ صرف سرسبز و شاداب تھا بلکہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ لیکن کسی دور میں یہ دریا آہستہ آہستہ خشک ہونے لگا اور لوگ یہاں سے نقل مکانی کرنے لگے۔ اور یوں یہ علاقہ ریت کے ٹیلوں میں تبدیل ہو گیا۔ کرنل ٹاڈ کا خیال ہے کہ یہ دریا سومرا خاندان کے عہد حکومت مں خشک ہوا۔ یہ قوم اب گروہی کے نام سے پہچانی

---

* صدر، شعبہ تاریخ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتی ہے۔ مگر ہیگ کا موقف یہ ہے کہ ہاکڑہ زمانہ قبل از تاریخ کا دریا تھا۔

محقق پروفیسر منور علی خان (سابق صدر، شعبہ تاریخ، بہاولپور یونیورسٹی) لکھتے ہیں یہ روپوش دریا جسے مورخوں نے سندھ کا گمشدہ دریا کہا ہے اسی ''پست سندھو'' نظام کی ایک شاخ تھا جس کی تائید رگ وید سے ہوتی ہے اور جو دریائے سندھ سے شروع ہو کر جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج کو شامل کر کے دریائے سرسوتی یا گھاگرا یا ہاکڑہ پر ختم ہوتا ہے۔

ہاکڑہ نام کی بستیاں بہاولپور کے صحرائی اور آباد علاقوں میں اب بھی موجود ہیں مثلاً سٹیشن کلانچ والا کے پاس موضع ہاکڑہ۔ دیہی علاقوں میں ہاکڑہ نام کی قوم بھی آباد ہے۔ اس قوم کے افراد مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں۔

دریائے ہاکڑہ کے خشک ہو جانے پر جو لوگ اپنی دھرتی پر جان نثار کرتے تھے وہ اسے چھوڑ کر جانے کو تیار نہ ہوئے اور یہیں زندگی بسر کرنے لگے۔ وہ بارش کے پانی سے بھرے ٹوبوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اسی پانی پر گزارا کرتے ہیں۔ چولستان کی وجہ تسمیہ مختلف بیان کی گئی ہیں۔

اس صحرا میں آندھی کثرت سے آتی ہے اور ریت کے ٹیلے ہواؤں کی زد میں آ کر ادھر ادھر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر دلشاد کلانچوی کے الفاظ میں ''اس شکست و ریخت اور اکھاڑ پچھاڑ کے عمل کو سرائیکی زبان میں ''چولن'' کہتے ہیں۔ موجودہ نام چولستان کا ایک ماخذ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ عراقیوں کے ہاں صحرا کے لیے لفظ ''چیلستان'' بھی بولا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس صحرا کو بھی چیلستان کا نام دیا گیا ہو جو بعد میں چولستان بن گیا ہو۔ اے۔ کے۔ خالد چیلستان کو صحرائے چولستان کی وجہ تسمیہ قرار دیتے ہیں۔[۲]

دریائے ہاکڑہ کے کنارے قدیم ترین قلعوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں قلعہ دراوڑ، قلعہ بجنوٹ، قلعہ میر گڑھ، قلعہ مروٹ، قلعہ موج گڑھ، قلعہ دین گڑھ، قلعہ ولہر، قلعہ جام گڑھ، قلعہ پھولڑہ وہ مشہور قلعے ہیں جو اپنے زمانے کی ثقافتی سماجی اور معاشی معاشرت کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ قلعے اپنی منفرد تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ان قلعوں کی قطار سی سندھ تک چلی جاتی ہے لیکن یہ قلعے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔

چولستان کو تھل اور روہی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ چولستان میں بسنے والے باشندوں کو روہی کی مناسبت سے ''روہیلا'' کہا جاتا ہے۔ آریاؤں، بدھ متوں، جاٹوں اور ارائینوں کی تہذیبوں کا روہیلوں کی طرز زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور انہوں نے اپنی بود و باش میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ احمد غزالی اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں۔

برسات میں ٹوبے بارش سے بھر جاتے ہیں جہاں سے انسان اور مویشی اکٹھے پانی پیتے ہیں۔ ان میں رینال، کورائی والا، نواں کوٹ، کھیر پر، مصری والا، بجنوٹ، دراوڑ، موج گڑھ، کھدائی جانبووالا، کالے پہاڑ، ٹھنڈی کھوئی اور جانو والی کے ٹوبے شامل ہیں۔ یہاں برسات کے موسم میں ہر طرف سبزہ اُگتا ہے اور مویشیوں کے چارے کا انتظام ہو جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اس لیے روہیلے ان ٹوبوں کے ارد گرد پڑاؤ ڈال لیتے ہیں۔

چولستان میں اکا دکا مستقل آبادیاں بھی ملتی ہیں مگر یہ آبادیاں کنوؤں کے ساتھ آباد ہیں۔ سردیوں میں ان کا گزارہ کنوؤں کے اس قلیل پانی سے ہو جاتا ہے لیکن گرمیوں میں یہ بھی پانی کے ذخائر اور چراگاہوں کی تلاش میں اپنے گھروں سے پچاس پچاس میل تک دور نکل جاتے ہیں اور موسم سرما میں واپس لوٹ آتے ہیں۔ رسول تر، دندار، موڈا، مکھمانی، شاہ والی اور موج گڑھ کنوؤں کی وجہ سے آباد ہیں لیکن چولستان کا زیادہ تر زیر زمین پانی اتنا کڑوا ہے کہ ناقابل استعمال ہے۔[۳]

چولستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصے کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا چولستان کہا جاتا ہے۔ شہری آبادیوں سے متصل چولستان کو بڑا جبکہ شہری آبادیوں سے دور حصے کو چھوٹا چولستان کہا جاتا ہے۔ یوں تو تمام تر چولستان ریت کے ٹیلوں اور مٹی کے تودوں سے بھرا پڑا ہے لیکن ٹیلوں اور تودوں کے درمیان بعض میدان بھی ہیں جنہیں مقامی زبان میں ''ڈاہر'' کہا جاتا ہے۔ ڈاہروں کے علاوہ چولستان میں سراب کا جال بھی بچھا ہوا ہے۔ یہ سراب بالکل ان روایتی ریت کے چشموں کی مانند ہیں جنہیں دیکھ کر پیاسا دوڑتا ہوا ان کے قریب جاتا ہے لیکن وہاں پانی کے موجوں کی بجائے سنہری ریت لہریں مارتی نظر آتی ہے۔ روہی کے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور گرمی کی شدت سے ان کے گلے اور ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں اور وہ دیوانگی کی حالت میں پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتے ہیں اور آخر یہی سراب ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔[۴] یہ صحرا ''تھل''، ''چولستان'' اور ''روہی'' کے ناموں سے پکارا جانے لگا۔ خواجہ فریدؒ کے کلام میں یہ تینوں نام مختلف جگہوں پر اسی صحرا کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ برسات کی آمد اور سبزے کا بیان کرنا ہو تو وہ ''روہی'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور صحرا کا مستند اور مجرد دینے کے لیے آپ لفظ ''چولستان'' استعمال کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ غلام فریدؒ سرائیکی کے علاوہ اردو، فارسی، سندھی، عربی، پوربی اور ہندی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ وحدۃ الوجود مسلک پر گامزن ایک عظیم صوفی تھے۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ ذوالحجہ کے آخری عشرہ ۱۲۶۱ھ بروز منگل چاچڑاں میں حضرت خواجہ خدا بخشؒ کے ہاں پیدا ہوئے جو کہ عیسوی حساب سے دسمبر ۱۸۴۵ء بنتا ہے۔ آپ کے والد کو حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے ساتھ خاص نسبت تھی اس لیے انہوں نے آپ کا نام غلام فرید رکھا۔ آپ کے والد کے پردادا حضرت خواجہ محمد شریف سلسلہ سہروردیہ میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے محمد عاقل، حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے جد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امجد حضرت مالک بن یحییٰ خطہ عرب سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان سمیت سندھ میں سکونت اختیار کی۔

خواجہ محمد عاقل کا انتقال ۸ رجب ۱۲۲۹ھ کو ہوا۔ ان کے صاحب زادے میاں احمد علی سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ وہ سادہ اور برگزیدہ عالم تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد ۹ شعبان ۱۲۳۱ھ کہ وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے بعد خواجہ غلام فریدؒ کے والد بزرگوار خواجہ خدا بخش جانشین بنے۔ اپنے بزرگوں کی طرح وہ بھی ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھے۔ سکھوں کے عہد حکومت میں بہاولپور کا نواب انہیں کوٹ مٹھن سے اپنی ریاست میں لے آیا۔ یہاں خواجہ خدا بخش نے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر چاچڑاں نامی گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔[۵]

خواجہ غلام فریدؒ نے خالص علمی ادبی اور صوفیانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ جب آپ کی عمر تین سال تھی تو آپ کی رسمِ بسم اللہ ادا کی گئی۔ حضرت خواجہ خدا بخش نے اس کار خیر کے لیے حضرت خواجہ تاج محمود کا نام تجویز کیا جو اس دور کی بہت بڑی روحانی و علمی شخصیت تھی۔ خواجہ تاج محمود نے خواجہ غلام فرید کو سامنے بٹھا کر فرمایا۔

”آکھ غلام فرید الف“

خواجہ صاحب نے مستانہ وار یہی الفاظ دہرا دیئے۔

”آکھ غلام فرید الف“

حضرت خواجہ تاج محمود بھی وجد کی حالت میں آنکھیں بند کر کے یہی دہرانے لگے یہ کیفیت دیکھ کر خواجہ خدا بخش نے قوالوں سے کہا کہ وہ یہ مصرع طرز کے ساتھ پڑھیں۔ جب قوالوں نے پڑھنا شروع کیا تو پوری محفل وجد میں آ کر جھوم اٹھی۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے اشارات فریدی میں خود فرمایا ہے کہ آپ کو صدر الدین نے قرآن پاک پڑھانا شروع کیا تھا۔ جب مولانا صدر الدین وفات پا گئے تو کلام پاک میاں محمد بخش سے پڑھ کر مکمل کیا۔ نظم کی کتب میاں احمد یار اور میاں برخوردار سے پڑھیں۔ درسی کتب میاں جی قائم الدین سے پڑھیں۔[۶]

حضرت خواجہ غلام فریدؒ ابھی صرف آٹھ برس کے تھے کہ ان کے والد ماجد اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور آپ کے بڑے بھائی حضرت خواجہ غلام فخر الدین نے آپ کی سرپرستی فرمائی۔ بہاولپور کے نواب صادق محمد خان نے حضرت خواجہ غلام فخر الدین سے درخواست کی کہ وہ خواجہ غلام فرید کی تربیت شاہی محل میں کرنا چاہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت خواجہ غلام فخر الدین برابر آپ کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتے رہے۔ تقریباً تیرہ برس کی عمر میں آپ نے اپنے برادر بزرگ حضرت خواجہ غلام فخر الدین کے دستِ حق پر بیعت کی اور ان کے روحانی کمالات اور فیوض و برکات حاصل کیں۔ جب آپ کے یہ مرشد اور بھائی اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو اس وقت آپ کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی۔ یہ ۱۲۸۸ھ کی بات ہے۔ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد آپ سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ شاہی محل میں پرورش پانے کے باوجود آپ کو عیش و آرام کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ کو بہاولپور کے ریگزاروں سے محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے عبادت و ریاضت کے لئے چولستان کا پرسکون ماحول چنا اور وہاں ایک جھونپڑی میں اٹھارہ سال مقیم رہے۔

خواجہ غلام فرید کی نظر میں چولستان جنتِ ارضی کا مقام رکھتا تھا۔ انہوں نے ریگستان کے ذروں میں حسن ازل کو دیکھا اسی لیے ان کی شاعری میں روہی کے خوبصورت حوالے ملتے ہیں۔ انہوں نے روہی کی معاشرت کو اپنی شاعری میں بطور علامتوں کے استعمال کیا۔

خواجہ غلام فریدؒ روحی میں ٹوبے کی معاشی اور معاشرتی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ ٹوبے سے وابستہ لوگوں کی ضروریات اور احساسات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے تھے۔ انہوں نے ٹوبا کھودنے کو دل کی کسی تمنا یا خواہش کے پورا ہونے کی علامت قرار دیا ہے۔ خشک ٹوبا ان کی شاعری میں پیاس اور محرومی کی علامت ہے اور ٹوبے کا بھر جانا مرادوں کے برآنے کی۔ خواجہ صاحب نے اپنی تین مسلسل کافیوں اور بے شمار شعروں میں ٹوبے کا خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے۔

حضرت خواجہ غلام فرید کے اشعار ہیں۔

روہی وٹھڑی ٹوبھا تار وے
آمل توں سینگا یار وے
تھئیے تھلڑے باغ بہار وے
چودھار گل گلزار وے

منظوم ترجمہ۔ کشفی ملتانی

روہی کی بارشوں سے تالاب بھر گیا ہے
اے یار آ کہ موسم کیسا نکھر گیا ہے
ٹیلے مہک رہے ہیں باغ و بہار بن کر
ہر سمت گل کھلے ہیں گلزار بن کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیلو روہی کا مخصوص پھل ہے۔ اسی کا درخت ''جال'' جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ خودرو پودا ہے جس پر سب کا حق سمجھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس پھل کو اپنا مسلک سمجھانے کے لئے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ پیلو کے درخت پر مختلف رنگ کا پھل ہوتا ہے۔ لال نیلی پیلی سبز کالی گلابی رنگ کی پیلو صحرا کے ماحول میں ایک عجب بہار دکھاتی ہے۔

خواجہ صاحب نے پیلو کے درختوں پر بُور آنے، ادھ پکے ہونے اور مکمل طور پر پک جانے کو معرفت کی منزل طے کرنے کے لئے تشبیہہ کے طور پر اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ ساون کا مہینہ ہو، صحرا کی وسعتوں میں بارش کی رم جھم ہو اور تاریک رات میں بجلی چمکتی ہو تو ایسے میں صوفی روحانی اسرار و رموز میں کھو جاتا ہے۔[8]

خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

آ چنوں رل یار پیلوں پکیاں نی وے

کئی بگڑیاں کئی ساویاں پیلیاں
کئی بھوریاں کئی پھکویاں نیلیاں
کئی اودیاں گلنار کٹویاں رتیاں نی وے

منظوم ترجمہ۔ شہاب دہلوی

آ چنیں یار پک گئے پیلو
ہیں سفید سبز اور پیلے کئی بھورے اور کئی نیلے
رنگ اودا کسی کا ہے گلنار دودھیا سرخ سب کے سب دلجو

چولستان کے لوگوں کی زندگی سادا اور محنت مشقت سے بھرپور ہے زیادہ تر لوگ بھیڑیں بکریاں اور دوسرے جانور پالتے ہیں۔ اس لیے دودھ دوہنا، دہی جمانا، لسی بلونا اور مکھن نکالنا اہم کام سمجھے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے روہی کی جٹیوں کا ذکر اسی کام کے حوالے سے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ تصوف کی دنیا میں ایسے کاموں کو مجاہدہ نفس سمجھا جاتا ہے۔

خواجہ صاحب کی ایک کافی کے اشعار ہیں۔

وچ روہی دے رہندیاں نازک نازو جٹیاں
راتیں کرن شکار دلیں دے ڈینھاں ولوڑن مٹیاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منظوم ترجمہ۔ ظہور نظر

صحرا میں رہتی ہیں نرمل، کومل، چنچل دوشیزائیں
شب بھر کھیلیں پھاگ دلوں سے دن کو کسی کے ہاتھ نہ آئیں
پوَ پھٹتے ہی مٹکے بھر بھر دہی بلوئیں، چھاچھ بنائیں

جب ہم خواجہ غلام فریدؒ کے کلام کو بغور پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمیں ان میں صرف ٹوبے پیلو اور لسی جیسی ثقافتی علامتیں ہی نہیں ملتیں بلکہ ہم روہیلوں کے رہن سہن رسم ورواج اور بود و باش کی تفصیل بھی پاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سیج، سنگار، سرخی، ماگ، کجلہ، زیوروں کا ذکر بھی بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے جیسا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا ہے

اج زیور یار پئے بھاندے ہن
متاں ڈینہہ سہاگ دے آندے ہن
کجلا مارو، دیداں بھالے
سرخی مسک مسک غم ٹالے
بولے بینے تے کٹمالے
سبھوں لپچے کھاندے ہن

منظوم مفہوم۔ اقبال ارشد

کرنیں سمٹ گئی ہیں تری پائے زیب میں
ٹیکے کا عکس، عکس جمال حبیب ہے
جھومر سے ہو رہے ہیں منور خطوط رخ
شاید کہ اب قریب وصال حبیب ہے
کاجل بھری نگاہ سے لطف و کرم ملے
لب کی کرن نے فکر فراموش کر دیا
بینے نے تیری صاف جبینیں اجال کر
قوس قزح کا ذکر فراموش کر دیا

غرض کہ چولستان اور وہاں کی معاشرت اپنے تمام تر حسن، سادگی اور سچائی کے ساتھ خواجہ صاحب کے کلام میں کچھ یوں سموگئی ہے کہ ہم روہی اور خواجہ صاحب کی شاعری کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ روہی خلوص و پیار کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامت ہے تو خواجہ صاحب کا کلام روہی کی محبتوں کا امین ہے۔

حضرت خواجہ غلام فریدؒ ۷ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ بمطابق ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء کو واصل حق ہوئے۔ اور کوٹ مٹھن شریف میں اپنے مرشد حضرت خواجہ فخر الدین کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

''جس قوم میں فرید اور اس کی شاعری موجود ہے وہ قوم محبت کے جذبوں سے کبھی الگ نہیں رہ سکتی''

☆☆☆

حوالہ جات

۱- بشیر آسی، روزنامہ جنگ، ملتان یکم مئی ۲۰۰۶ء۔

۲- احمد غزالی، چولستان۔

۳- درثمین نقوی، چولستان تاریخ کے آئینے میں۔

۴- بشیر آسی، روزنامہ جنگ ملتان، یکم مئی ۲۰۰۶ء۔

۵- محمد افضل خان، (مرتب) کلیات خواجہ فرید۔

۶- ڈاکٹر ابو اعجاز ''رستم پر اسرار بندے؛ حضرت خواجہ غلام فریدؒ''، سنڈے ایکسپریس، ۲۲ جون ۲۰۰۸ء۔

۷- پروفیسر دلشاد کلانچوی فریدیات۔

۸- ایضاً۔

۹- منظوم ترجمے، از خواجہ فرید کی شاعری کا اردو روپ۔ مرتب- ظہور احمد دھریجہ۔

© rasailojaraid.com